اعلیحضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
قصیدۂ معراجیہ
پر ایک تحقیقی مقالہ
از پروفیسر مرزا نظام الدین بیگ جام بنارسی
باھتمام: شاہ تراب الحق قادری
شائع کردہ
بزم اہلسنت کراچی
اخوند مسجد کھارادر کراچی

تعارف

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی ذات گرامی چودھویں صدی ہجری کی علم و ادب کے نابغۂ روزگار شخصیتوں میں ایک ممتاز منفرد مقام کی حامل ہے۔

یہ ہمارے لئے بڑے افسوس کا مقام ہے کہ نصف صدی تک اس عظیم شخصیت کے علمی اور ادبی کارناموں سے برصغیر کے مسلمانوں نے سخت لے اعتنائی برتی اور ان جیسی یادگار زمانہ ہستیوں کے کارنامے جس تشہیر اور اشاعت کے مستحق تھے وہ ان کو نہ ملی، اگر علم و حکمت کا یہ سرمایہ کسی اور قوم میں ہوتا تو وہ قوم ان کو اپنے محسن کی حیثیت سے یاد رکھتی۔ ان کی ذات کو اپنی تاریخ میں بلند ترین مقام عطا کرتی۔ اب جب کہ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں سے علم و حق کے متلاشی محققین نے پردہ اٹھانا شروع کیا ہے تو اہل علم و دانش ورطۂ حیرت میں ہیں کہ

اللہ اللہ کیا مقام ہے امام احمد رضا کا

اردو ادب اور شعر و شاعری اور خصوصاً نعتیہ شاعری میں امام رضا کے مقام کا آج تک کوئی تعین نہ کیا گیا۔ حالانکہ ان کے ہمعصروں امیر مینائی داغ اور محسن کاکوروی کو بڑا مقام دیا گیا اور ان پر بہت کچھ لکھا گیا مگر بقول اکبر الہ آبادی مرحوم ؎

کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

آج ۶۰ برس کا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد ہی جب ناقدین ادب کی نظرِ کرم امام رضا کے چمنستان قلم پر پڑی تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ ؎

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم

جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

اسی طرح میرے محترم عزیز! برادرم مرزا نظام الدین بیگ جام بنارسی جو قومی عجائب گھر میں مخطوطات کے شعبہ میں انچارج ہیں اور ادبی

شوق و ذوق کے ساتھ ساتھ علمی گہرائی اور گیرائی بھی رکھتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک دل درد مند بھی رکھتے ہیں، جب امام رضا کے نعتیہ کلام سے واقف ہوئے تو بے اختیار پکار اٹھے کہ ؎

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالہ حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

مرزا صاحب، جو خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور شعر و سخن کے رموز و نکات سے بخوبی آگاہ ہیں، اردو اور فارسی دونوں ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں فارسی میں ایم اے ہونے کے علاوہ فارسی میں مصنوعاتی شاعری پر ڈاکٹریٹ کے لیئے مقالہ بھی لکھ رہے ہیں۔ مرزا صاحب نہ تو امام رضا کے مرید ہیں اور نہ متوسلین میں سے ہیں اور نہ ہی معتقدین اور محبین میں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مقالے کی تحریر سے پہلے امام احمد رضا قدس سرہٗ کے علمی اور ادبی کارناموں سے کچھ زیادہ واقف بھی نہ تھے۔

اس مقالے کی تحریر و تحریک کا سبب وہ ایک چھوٹی سی نعتیہ نشست بن گئی جو ایک جمعہ کی شام بعد نماز جمعہ مولانا مصلح الدین قادری مدظلہٗ العالی کی مسجد میں بعد نماز جمعہ حسب معمول منعقد ہوئی تھی۔ مرزا صاحب میری دعوت پر یہاں نماز جمعہ پڑھنے آئے تھے اور اتفاق سے اس دن محترم المقام سیدی مولانا تقدس علی خاں صاحب دامت برکاتہم عالیہ (داماد حضرت حجتہ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا خاں قدس سرہٗ العزیز) شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ پیر گوٹھ شریف بھی ساتھ تھے۔ مولانا کے یہاں چند بچوں نے اعلیحضرت امام احمد رضا کی چند نعتیں بڑے ترنم انداز میں سنائیں مرزا صاحب ایک روحانی سرور اس محفل سے لے کر اٹھے

وہاں سے میں، حضرت مولانا تقدس علی خاں دامت برکاتہم عالیہ اور مرزا صاحب میرے غریب خانے پر آئے۔ یہاں نعتیہ شاعری کا ذکر چلا اور حضرت مولانا نے امام رضا کی چیدہ نعتوں کے کچھ اشعار مرزا صاحب

کو سنائے۔ پھر میں نے ان کے دیوان سے ان کے اصرار پر کچھ مزید اشعار
اردو اور فارسی کی نعتوں کے سنائے آخر میں قصیدۂ معراجیہ پورا
سنایا۔ مرزا صاحب کلام رضا سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو حیرت
ہوئی کہ اردو نعتیہ شاعری کے اس دُرِ بے بہا کو اردو ادب کے ناقدوں
اور تذکرہ نگاروں نے اُردو کی تاریخ کی تزئین میں مناسب مقام
کیوں نہیں دیا۔ انھوں نے قصیدۂ معراجیہ کی زبان کی سادگی، سوز و گداز، شاعرانہ بندشوں
اور خیالات کی بلند پروازی سے اس قدر تاثر لیا کہ اسی وقت یہ عزم ظاہر کیا کہ امام رضا کے قصیدۂ
معراجیہ پر وہ جلد ہی ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالہ سپرد قلم کریں گے۔ چنانچہ ۲ دو ماہ کی طویل تحقیقی
کاوش کے بعد مرزا صاحب نے یہ مقالہ عام اشاعت کے لئے میرے حوالے کیا۔

مرزا صاحب نے کسی کاوش اور تحقیق کے ساتھ یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے اِس کا اندازہ قاری
کو مقالہ کے اندازِ بیان، الفاظ و زبان، ترتیب و تدوین، مستند حوالہ جات اور شاعرانہ رموز و نکات
کی تصریحات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب نے جس محنت اور محبت سے یہ مقالہ تحریر کیا ہے اسلئے وہ ہم سب کے
اور خصوصاً تمام اہل علم حضرات کے شکریہ کے مستحق ہیں، اور نفس مضمون کی پاکیزگی کے اعتبار سے جزائے خیر کے
سزاوار بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کے وسیلے سے انکی یہ سعی قبول فرمائے۔ اور دنیا و
آخرت دونوں میں انکو بہترین اجر عطا فرمائے اور ساتھ یہ بھی دعا ہے کہ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

ہمیں امید ہے کہ مرزا صاحب امام رضا قدس سرہ کی نعتیہ شاعری پر مزید اپنے علمی و تحقیقی
نگارشات سے علم و ادب کے پیاسوں کو نوازیں گے اور اپنے تحقیقی اور علمی منصب کو فروزاں بنائیں گے

آخر میں ہمیں یہ بھی اُمید ہے کہ مرزا صاحب کے اس تحقیقی شہ پارے کے منظر عام پر آنے
کے بعد دوسرے اہل قلم اور اہل علم حضرات بھی اس نقش اول کو آگے بڑھائیں گے اور امام احمد رضا
قدس سرہ العزیز کے علمی اور ادبی کارناموں پر تحقیقی کام سپرد قلم کر کے اپنے سر سے اس الزام کو
اٹھائیں گے کہ انھوں نے امام صاحب کے علمی اور ادبی کارناموں کے ساتھ بے اعتنائی اور تعصب
کا مظاہرہ کیا۔

مورخہ ۸ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ
۹ دسمبر ۱۹۷۸ء

خاکپائے
امام احمد رضا
وجاہت رسول قادری رضوی ۲۰/ تمہ بی-ان-اس شفا کراچی

حرفِ آغاز

عالی حضرت بریلوی کے نام نامی سے صغر سنی سے آشنا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے عم محترم جناب وزارت رسول قادری مرحوم امام موصوف کے متوسّلین میں تھے۔ ان کو مولانا حامد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ پسر عالی حضرت سے بیعت کا شرف حاصل تھا اور میں عم محترم سے بہت قرب رکھتا تھا لیکن وہ دور میری وارفتہ مزاجی کا دور تھا۔ عروسِ سخن کی عشوہ طرازیوں نے میرے شعور کی رو کو اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ لہٰذا سنجیدہ علوم کے مطالعہ یا موضوعاتی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے کی فرصت ہی نہ تھی اور پھر ایک خیال جو یقیناً فکر کی ناپختگی کے باعث ان دنوں مجھ پر مسلّط تھا وہ یہ تھا کہ خالص مذہبی عالم خوبصورت شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے عالی حضرت کے کلام کی طرف میری توجہ سماعت کے دائرے سے گزر کر ذہن کی سطح تک نہ پہنچ سکی۔ لیکن ایک طویل مدّت بعد اچانک امام موصوف کے نعتیہ کلام سے متعلق میرا یہ خیال واہمہ ثابت ہوا۔

ایک دن برادرم سید وجاہت رسول قادری پسر ارشد سید وزارت رسول قادری مرحوم ومغفور کی اقامت گاہ پر جانا ہوا وہاں قبلہ مولانا تقدس علی خان صاحب بھی تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد گفتگو کا رخ عالی حضرت کی شاعری کی طرف بدل گیا۔ برادرم وجاہت رسول نے، جو ستھرا شعری ذوق رکھتے ہیں اور خود بھی اچھے شعر کہتے ہیں، عالی حضرت کا کلام سنانا شروع کیا۔ مختلف اشعار پڑھنے کے بعد جب حضرات کا قصیدۂ معراجیہ شروع کیا۔ میں چونک پڑا۔ مولانا پر وجد کی کیفیت طاری تھی اور میں سراپا حیرت بنا بیٹھا تھا۔ اچانک میرے ذہن کے تمام دریچے کھل گئے۔ میری فکر کلام کے مختلف النوع محاسن کے گوشوں کو ٹٹولنے لگی۔ میرے ذہن پر اس نظم کا تاثر بہت گہرا قائم ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں مولانا نظامی گنجوی، امیر خسرو دہلوی اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کے خمسوں کا تقابلی جائزہ لے رہا تھا اور اس وقت خاص طور پہ ان عظیم شعراء کی مثنویات میں معراج نامے میرے پیشِ نظر تھے۔ چنانچہ میں نے اعلیٰحضرت کے معراجیہ قصیدے پر ایک مقالہ قلمبند کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال رہی اور اس مقالہ کی تکمیل ہو گئی۔

شاعری ہنا خانۂ ذات کی موزوں الفاظ میں عکاسی ہے۔ اس عکاسی میں محض ذات

کا رنگ نہیں ہوتا بلکہ ماحول اور گرد و پیش کا عکس ہم آہنگ ہوکر شعر کے روپ میں ڈھلتا رہتا ہے۔ یہ روپ ہمیشہ ارتقاء پذیری کا میلان رکھتا ہے اور اس کے نقوش میں غیر محسوس تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں داخلیت کا عکس گہرا ہو جاتا ہے اور خارجی رنگ کی لہریں دبی دبی رہتی ہیں اور کہیں اس کے فکری خد و خال میں خارجی رنگ کی گلکاریاں اپنا تشخص نمایاں کر لیتی ہیں۔ میری شاعری اور اس کا فکری محور ذات کی ہم آہنگی کے ساتھ خارجی ہے۔ بہ الفاظ دیگر میں نے غم جاناں کی تلخ کامیوں کو غم دوراں کی زہرناکیوں میں سمو لیا ہے۔ چنانچہ میری فکر ان مسائل کو اشعار میں ڈھالتی رہی ہے جو ۳۲ سال گزرنے کے بعد بھی ہنوز ہماری قوم کے جسم کا ناسور بنے ہوئے ہیں۔ یعنی بھوک، افلاس اور دولت کی غیر منصفانہ اور ناہموار تقسیم —— کون ان مسائل سے چشم پوشی کر سکتا ہے اور پھر شاعر جسے مبداءِ فیاض نے درد آشنا دل دیا ہو ——

یہ چند اشعار میری شعری فکر کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں :۔

چمن میں گو رُت بہار کی ہے فضا میں لیکن تھکن وہی ہے
یہ کیسے جھونکے نسیم کے ہیں قبائے گل میں شکن وہی ہے

بدل بدل کر لباسِ رنگیں ہوئے ہیں مسند نشین محفل
نئی قباؤں میں جلوہ افگن ہجومِ صد اہرمن وہی ہے

ابھی تو فرہاد کے لہو سے ہے محل پرویز میں چراغاں
ردائے محرومیت میں لپٹا مقدّر کوہکن وہی ہے

ابھی تو سفاک تیغ باطل لہو میں حلاّج کے ہے ڈوبی
کلاہِ جاہ و حشم کی خاطر فروغِ دار و رسن وہی ہے

ہماری ہستی کے قافلے تو لٹا کئے ہیں لٹا کریں گے
لباسِ رہبر میں رہزنوں کی جگہ جگہ انجمن وہی ہے

مرزا نظام الدین بیگ جامؔ

عمر ہا در کعبہ و تبخانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

بلاشبہ حیات ایک مدت تک کعبہ و تبخانہ میں سرگرمِ فغاں رہی تب کہیں بزمِ عشقِ محمدی میں امام احمد رضا جیسا دانائے راز نمودار ہوا۔ وہ بزمِ پیامِ محمدی کے آداب شناس دانائے راز بھی تھے اور جامِ بادۂ احمدی کے خمود آگاہ بادہ گسار بھی۔ ان جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں صدیوں بعد منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتی ہیں۔ ان کی شخصیت جامع صفات تھی۔ وہ دنیائے اسلام کے ایک فقید المثال محقق تھے۔ علوم دینی و دنیوی کا مہتم بالشان منارۂ نور تھے جس کی ہر شعاع ظلمتوں میں بھٹکتے ہوئے راہی کی راہوں کا تعین کرتی ہے۔ دینی اور دنیوی علوم کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جسے ان کی جولانی طبع نے اپنی تگ و تاز کا مرکز نہ بنایا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک سالکِ راہِ طریقت بھی تھے جو ایقان کی منزل سے گذر کر اپنے پیچھے رشد و ہدایت کی تاباں کہکشاں چھوڑ جاتا ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ ۱۴ جون ۱۸۵۶ء میں جہاد حریت سے ایک سال قبل شہر بریلی (اتر پردیش، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تکمیل کر کے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے اور ۵۴ سال تک مسلسل دینی اور علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ عربی، فارسی اور اردو میں مختلف علوم پر ایک ہزار کتب آپ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے وفات پائی۔ ؏۱

ایک ایسی پہلو دار نور بداماں شخصیت جس کا ہر رخ خیرہ کن ہے۔ مجھ جیسے بے مایہ اور بے بضاعت انسان کے لئے اس کے کسی ایک رخ پر ہی سہی خامہ فرسا ہونا بہت دشوار مرحلہ ہے۔ ان کی قد آور شخصیت کا تنوع کچھ ایسا ہمہ گیر ہے کہ بیک وقت سب کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ وصف شناس اہل علم و دانش ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھاتے رہے ہیں۔ اس وقت میرے اشہب فکر کو ان کی جس صفت نے مہمیز کیا وہ ان کی ذات گرامی کا داخلی حسن اور قلبی لطافت ہے جس کا عکس ان کی نعتیہ شاعری میں جلوہ فگن ہے۔

ادبی مؤرخین اور ناقدانِ شعر و ادب کی یہ عجب چیرہ دستی ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کے نعتیہ کلام کو اپنی نگارشات میں جگہ نہیں دی۔ "خمخانۂ جاوید" ؏۲ کے مصنف لالہ سری رام اپنے تذکرۂ شعرا کی دوسری جلد میں امام موصوف کے چھوٹے بھائی مولانا حسن رضا بریلوی کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نعت گوئی میں اپنے برادر بزرگوار مولوی احمد رضا خان سے مستفیض ہیں۔" بڑے حیرت

؏۱:۔ سوانح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا، مولفہ مولانا بدرالدین احمد رضوی ۱۹۶۳ء ص ۸۹

؏۲:۔ خمخانۂ جاوید، جلد ۲، لالہ سری رام ص ۴۵۵، بحوالہ مضمون کالیداس گپتا رضا مطبوعہ المیزان امام احمد رضا نمبر، بمبئی، ص ۴۷۴

کی بات ہے شاگرد کا تذکرہ تو ہے اور استاد کے بارے میں ایک سطر بھی نہ لکھی گئی۔ چنانچہ بعد کے تذکرہ نگار بھی لالہ سری رام کی تقلید میں نعت گو شعرائیں ان کے مقام کو نظر انداز کرتے رہے حتیٰ کہ علی جواد زیدی تک نے اپنی کتاب "قصیدہ نگاران اتر پردیش"[1] میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا جبکہ نعتیہ قصائد کا انتخاب موجود ہے اور امیر مینائی اور محسن کاکوروی ان کے انتخاب میں شامل ہیں۔

کیا ان کا کلام معیار شاعری پر پورا نہیں اترتا؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے یہاں میں انکی شاعری کے متعلق اردو ادب کے ایک صاحب طرز ادیب اور نقاد نیاز فتحپوری کی رائے پیش کر رہا ہوں۔ نیاز صاحب ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "میں نے مولانا بریلوی کا نعتیہ کلام بالاستیعاب پڑھا ہے۔ ان کے کلام میں پہلا تاثر جو پڑھنے والے پر قائم ہوتا ہے وہ مولانا کے بے پناہ وابستگی رسول عربی کا ہے ان کے کلام سے ان کے بیکراں علم کے اظہار کے ساتھ افکار کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے"[2]

اردو زبان کے ایک بڑے استاد اور جید محقق پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب امام موصوف کے بارے میں رقمطراز ہیں" اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک عاشق رسول یعنی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ذکر بھی کر دیا جائے جس سے ہمارے ادباء نے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے غالباً یہ واحد عالم دین ہیں جنہوں نے نظم و نثر دونوں میں اردو کے بے شمار محاورات استعمال کیے ہیں اور اپنی علمیت سے اردو شاعری میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔"[3]

---

[1]:۔ قصیدہ نگاران اتر پردیش، علی جواد زیدی، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

[2]:۔ ترجمان اہل سنت، کراچی، شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۷۵ء صـ ۲۹

[3]:۔ مجلہ فکر و نظر اسلام آباد، شمارہ جنوری ۱۹۷۶ء صـ ۵۶۸

ان دو مشاہیر علمائے ادب کی آراء کے بعد یہ وسوسہ تو قطعی ختم ہو جاتا ہے کہ ان کا کلام درخورِ اعتنا نہیں ہے پھر کیا بات ہے؟ دراصل مورخین اردو ادب نے نعتیہ شاعری ہی کو سرے سے نظر انداز کیا تو نعت گو شعراء کو درخورِ اعتنا کیسے سمجھتے جبکہ ماہر یہی نعتیں ہیں اگرچہ مرثیہ اور مرثیہ نگار شعراء کو اردو ادب کی تاریخ میں قرار واقعی وہ مقام دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔

وہ فرماتے ہیں "میری ناقص رائے میں موضوعاتی شاعری کے بارے میں ہمارے ناقدین کی یہ رائے سوچی سمجھی نہیں ہے۔ دنیا کے شعری کارناموں کو ذہن میں ابھاریئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کارناموں میں سے بیشتر کا تعلق غیر موضوعاتی شاعری سے نہیں خالص موضوعاتی شاعری سے ہے۔ کالیداس کے منظوم ڈرامے، ہومر کی الیڈ وا وڈیسی ویاس کی مہابھارت، تلسی داس کی رامائن، فردوسی کا شاہنامہ، نظامی گنجوی کا خمسہ ورجل کی اینڈ، ملٹن کی فردوس گمشدہ، ڈانٹے کی طربیہ ربانی اور گوئٹے کی فاؤسٹ سب موضوعاتی شاعری کی ذیل میں آتی ہیں لیکن کیا محض اس بناء پر کوئی شخص ان نظموں کو کم مرتبہ خیال کرے گا۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اس نوع کی دوسری نظموں کو کم مایہ اور بے وقعت خیال کرنا مناسب بات نہ ہوگی۔ بلکہ انیس کا کا مرثیہ ہو یا حالی کا مسدس، میر حسن کی مثنوی سحر البیان ہو یا دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم شبلی و اقبال کی تاریخی نظمیں ہوں یا امیر و محسن کے نعتیہ قصیدے۔ ہمارے دور میں حفیظ کا شاہنامہ ہو یا ماہر القادری کی "ظہور قدسی" محشر رسول نگری کی "فخر کونین" ہو یا عبدالعزیز خالد کی فارقلیط ان میں سے کسی ایک کو بھی بشرطیکہ وہ شاعرانہ لوازم پر پوری اترتی ہو محض موضوعاتی شاعری کی بناء پر نظر انداز کرنا ناانصافی ہوگی۔" ؏۱

ڈاکٹر فرمان نے تو نعت کے سلسلے میں ایک عام بات کہی ہے۔ لیکن جہاں تک

؏۱ اردو کی نعتیہ شاعری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۲۷

امام احمد رضا کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر ناقدانِ شعر وادب نے ان کے افکار کا امعان نظر سے مطالعہ ہی نہیں کیا۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ شخصیت ان کی دینی شخصیت میں ایسی دب گئی تھی کہ عام طور پر ان کو شاعر کی حیثیت میں دیکھنا دشوار تھا۔

دوسری اہم وجہ جو مجھے شدت سے محسوس ہوئی ہے وہ امام موصوف کے مجموعہ کلام کے معتبر اڈیشن کا فقدان ہے۔ جتنے اڈیشن اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں کوئی بھی ادبی معیار پر نہیں اترتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیق اور حواشی کے ساتھ محققانہ اڈیشن شائع ہوتا کہ صاحبانِ علم کی توجہ کا مرکز بن سکے شاعری بالذات ان کا مقصد حیات نہ تھی بلکہ ایک ذریعہ تھا اس سوزِ دروں کے انعکاس کا جس کی آگ میں ان کا وجود معنوی سلگ رہا تھا لہٰذا ان کے قلم سے نکلے ہوئے اشعار ان کے لالہ دل پر ٹپکتے ہوئے شبنمی قطرات تھے جس سے ان کو ٹھنڈک ملتی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

ثنائے سرکار ہے وظیفہ قبول سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس، نہ پروا روی تھی کیا کیسے قافیئے تھے

ان کی شاعری تمام تر داخلی واردات کا نتیجہ ہے جس کا محور سرورِ کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ وہی ان کا محبوب، مدعا مرکز نگاہ اور سکون قلب وجگر ہیں۔ قضا وقدر نے اس گلشن تخلیق میں امام احمد رضا کو اسی حسن لالہ رخ کی غزل سرائی کے لئے بھیجا تھا۔ جس کا احساس خود ان کو بھی ہے فرماتے ہیں:۔

ز حسنت تا بہار تازہ گل کرد
رضایت راغزلخواں آفریدند[1]

---

[1] ۱۔ حدائق بخشش حصہ دوم، کامیاب دار التبلیغ لاہور۔ ص ۱۵

ان کی شاعرانہ فکر کا دامن بلحاظ موضوع صرف نعت اور منقبت تک محدود ہے۔ موضوع کی یکسانیت کی وجہ یہ ہے کہ انکی شاعری کا سرچشمہ واردات قلبیہ ہیں افکار ذہنی نہیں۔ شاعری ان کی فکری جولانیوں کا مظہر نہ تھی چارۂ دردِ نہاں تھی۔ انکی ذہنی درّاکی کا ظہور تو ان کی مختلف النوع علوم کی تصانیف میں موجود ہے۔ لیکن ان کے نہاں خانۂ دل کی ہنگامہ آرائیاں ان کی نعتوں ہی میں دیکھنا ممکن ہے۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ انکے چمنستانِ نعت کی سیر حاصل گلگشت کی جائے۔ لیکن اپنی عدم یکسوئی کی وجہ سے یہ خیال ممکن نہیں فی الحال اہل علم کے سامنے ان کے معراج نامہ کا جائزہ پیش کر رہا ہوں۔

قبل اس کے کہ امام موصوف کے معراج نامہ سے بحث کی جائے ضروری ہے کہ پہلے واقعہ معراج کا مجملاً ذکر کر دیا جائے۔

معراج نبوی کا اجمالی خاکہ

واقعۂ معراج حضرت ختمی مرتبت کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ خالق کائنات نے اس کے ذریعہ کائنات کے اسرار و رموز آپ کی ذات اقدس پر منکشف کر دیئے۔ آپ نے ازل تا ابد زمانے کا مشاہدہ کیا اور ساتوں افلاک کی سیر کی۔ ذات خداوندی کا اتنا قرب حاصل کیا کہ کوئی بشر اس قربت تک نہ پہنچ سکا تھا۔

آنحضرت کا یہ سفر آسمانی شب کی تاریکی میں پیش آیا تھا اس لئے یہ "اسراء" کہلاتا ہے۔ جس کے معنی لے چلنے یا لے جانے کے ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "عُرج بی" یعنی مجھ کو اوپر چڑھایا گیا۔ چنانچہ اس وجہ سے اس واقعہ کا نام معراج پڑ گیا۔

قرآن کریم میں معراج کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔ سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ [۱] - (پاک ہے وہ خدا جو لے گیا اپنے بندے کو) اور پھر اس قرب کی تصدیق اس طرح کر دی گئی۔ ثمّ دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین۔ [۲]

یہ واقعہ ہجرت سے ایک یا ڈیڑھ سال قبل کا ہے۔ اس کی تاریخ اور مقام کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے ہے۔ لیکن مستند ۲۷ رجب کی شب سمجھی گئی ہے۔ مقام کے بارے میں بھی دو روایتیں ہیں۔ جہاں سے آپ سفر معراج پر روانہ ہوئے۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ آپ کعبہ سے متصل شمال میں کشادہ جگہ پر محو خواب تھے کہ معراج حاصل ہوئی تو دوسری روایت یہ ہے کہ آپ اپنی عم زاد بہن ام ہانی کے گھر پر بیداری اور خواب کی درمیانی کیفیت میں بستر استراحت پر دراز تھے کہ اسی عالم میں گھر کی چھت شق ہوئی اور حضرت جبرئیل دوسرے فرشتوں کے ہمراہ تشریف لائے اور آپ کو اٹھا کر پہلے چاہ زم زم پر لے گئے سینۂ مبارک چاک کر کے قلب اطہر نکالا اور اسے آب زم زم سے دھویا پھر آپ کے قلب کو ایمان و حکمت سے بھر دیا اور دوبارہ دل کو اصل جگہ رکھ کر سینہ بند کر دیا۔

شقِ صدر کے بعد حضرت جبرئیل نے حضور کی سواری کے لئے براق پیش کیا یہ لفظ برق سے مشتق ہے۔ اس کی رفتار بجلی کی طرح تیز تھی اسی لئے اسے براق کہا گیا۔ برق کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ روایت یہ ہے کہ براق ایسی تیز رفتار سواری تھی کہ جہاں حدِ نظر ختم ہوتی تھی وہاں اس کا پہلا قدم پڑتا تھا۔

حضور براق پر سوار ہو کر بیت المقدس پہنچے۔ براق سے اتر کر مسجد

---

[۱] - سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱

[۲] - سورۃ النجم آیت ۸

اقصیٰ میں تشریف لے گئے" یہاں تمام انبیا اور ملائکہ نے آپ کا استقبال کیا پھر آپ کی امامت میں دو رکعت نماز ادا کی

اس کے بعد حضور نے حضرت جبرئیل کی معیت میں زمین سے آسمان تک بُراق پر سفر کیا۔ یہاں بھی روایت میں اختلاف ہے بعض روایت یہ بھی ہیں کہ بُراق کو آپ نے بیت المقدس میں چھوڑ دیا۔ آسمان سے ایک مرصّع سیڑھی نمودار ہوئی اس کے ذریعے حضرت جبرئیل کے ساتھ آسمان پر گئے۔ وہاں حضور نے مختلف آسمانوں کی سیر کی جس میں مختلف مشاہدات ہوئے جس کی تفصیل معراج کے واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ساتویں آسمان کے بعد آپ کو جنت کی سیر کرائی گئی یہاں سے آنحضرت سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے۔ یہ مقام ملائک کی گذرگاہ کی آخری حد ہے۔ سدرہ کے معنی بیری کے درخت کے ہیں یہاں پہنچ کر حضرت جبرئیل کی پیش قدمی رک گئی سدرۃ المنتہیٰ پر امر الٰہی کا پرتو تھا وہ جب اس درخت پر چھا گیا تو اس کی ہیئت بدل گئی اور انوار الٰہی کے حسن کی وہ شان پیدا ہوئی جس کا بیان ناممکن ہے۔ یہاں سے حضور حجابات کی منزل سے گذر کر خالق سے ہمکلام ہوئے اور نور الٰہی کا مشاہدہ کیا۔ بارگاہ الٰہی سے حضور کو عطیات مرحمت کیے گئے۔ اس کے بعد آپ دنیائے آب و گل میں واپس تشریف لے آئے۔ [۱]

معراج رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہماری شاعری کا ایسا اہم موضوع ہے کہ زمانہ قدیم سے کم و بیش ہر چھوٹے بڑے شاعر کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے کسی نے باقاعدہ اپنا موضوع بنا کر مبسوط ترجمانی کی ہے اور کسی نے محض چند اشعار میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ جن قدیم شعراء کے معراج نامے میری نظر سے

---

[۱]: عبدالکریم عابد کے مضمون "معراج نبوی" مطبوعہ سیارہ ڈائجسٹ۔ رسول نمبر جلد اوّل سے ماخوذ۔

گذرے حسب ذیل ہیں

۱۔ سید بلاقی   اس کا معراج نامہ دکنی زبان میں ہے اور ۱۰۸۰ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں معراج کے واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ آسمانوں کی سیر کا حال بھی بیان ہوا ہے

۲۔ سلطان معظم   دکنی زبان میں ہے اور اس کا بھی سال تصنیف ۱۰۸۰ھ ہے معراج کے واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ مختار   اس کا معراج نامہ ۱۰۹۴ھ کی تصنیف ہے اور دکنی زبان میں ہے۔ معراج کے بیان میں تفصیلی مثنوی ہے لیکن مختار نے روایات کی صحت کا خیال رکھا ہے

۴۔ ھاشمی   سید میراں نام بیجاپور وطن تھا۔ سید شاہ ہاشم علوی کا مرید تھا اس لئے ہاشمی تخلص کرتا تھا۔[ع۱]   اس کا معراج نامہ بھی تفصیلی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیف کا زمانہ معلوم نہیں لیکن سکسینہ نے اپنی تاریخ میں اس کا سال وفات ۱۱۰۹ھ درج کیا ہے[ع۲]۔ لہٰذا ہاشمی کا معراج نامہ یقیناً ۱۱۰۹ھ کے پہلے کی تصنیف ہے۔

۵۔ فتاحی   اس کے معراج نامہ کی تصنیف کا زمانہ معلوم نہیں لیکن اس کی ایک تصنیف "وفات نامہ سرور کائنات" ۱۱۱۱ھ[ع۳] کی تصنیف ہے

فتاحی کا معراج نامہ غلط روایات کا طومار ہے۔ اس کے بارے میں مشہور عالم اور نعت گو شاعر باقر آگاہ (متوفی ۱۲۲۰ھ)[ع۴] لکھتا ہے

ع۱:۔ اردو ترجمہ تاریخ ادب اردو، مرزا محمد عسکری، لاہور، ص ۶۷

ع۲:۔ ایضاً۔ ص ۶۸

ع۳:۔ اردو میں نعتیہ شاعری، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اشفاق، کراچی، ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۶۶

ع۴:۔ ایضاً۔ ص ۱۹۶

جیسا فتاحی لکھا ہے معجزات   اکثر اس میں ہے غلط اور جھوٹ بات

اور یوں نور و شمائل کا بیان   اور یوں معراج نامہ اہے میاں

اور وفات شاہ کا ذکر اس نمط   اکثر ان نسخوں کا مضمون ہے غلط[1]

۶۔ اعظم   اس کے معراج نامہ کا بھی سال تصنیف معلوم نہیں۔ جو نسخہ قومی عجائب خانہ میں ہے ۱۱۲۰ھ کا مکتوبہ نسخہ ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ معراج نامہ بھی دوسرے دکنی زبان کے معراج ناموں کی طرح ہے۔

۷۔ محمد مہدوی   یہ معراج نامہ ۱۱۸۱ھ کی تصنیف ہے اور دکنی انداز میں کہا گیا ہے۔

۸۔ پیر اللہ مجرمی   اس کی بھی تصنیف کا زمانہ معلوم نہیں اور نہ شاعر کا زمانہ معلوم ہو سکا ہے لیکن اسکی زبان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بارہویں صدی کا ہے۔

۹۔ شیدا :۔   نوازش علی خان نام اور شیدا تخلص تھا۔ نواب نظام علیخاں کے میر ساماں تھے۔ ان کی ایک ضخیم مثنوی "اعجاز احمدیؐ" ہے جو ۱۱۸۶ھ کی تصنیف ہے[2]۔

یہ معراج نامہ اسی "اعجاز احمدیؐ" کا حصہ ہے۔ شیدا کی مثنوی "اعجاز احمدیؐ" کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین کا خیال ہے۔ صحت روایات ضخامت اور قدامت کے اعتبار سے نعتیہ ادب میں یہ مثنوی مولانا محمد باقر آگاہ کی ہشت بہشت کے بعد نہایت گراں قدر تصنیف ہے[3]۔

چنانچہ صحت روایات کے لحاظ سے شیدا کا معراج نامہ درست ہے لیکن

۱:۔ اردو میں نعتیہ شاعری، ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق، کراچی، ۱۹۷۶ء ص ۲۰۰

۲:۔ اردو میں نعتیہ شاعری، ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۸۷

۳:۔ ایضاً۔ ص ۱۹۵

انداز وہی ہے جو اس کے پیش رو دکنی شعراء کا ہے۔ لیکن کلام میں شعریت ضرور نظر آتی ہے۔ اور زبان بھی بڑی حد تک صاف اور رواں ہے

۸۔لچھمی نرائن شفیق وفات ۱۲۲۳ھ	غلام علی آزاد کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتا ہے صاحب بھی تخلص کرتا تھا۔ اس کے معراج نامہ کا جو مخطوطہ

قومی عجائب خانہ میں موجود ہے اس میں تخلص صاحب ہے۔ اس کا وطن اورنگ آباد تھا۔ اس کے دو تذکرے "چمنستان شعرا" اور "گل رعنا" بہت مشہور ہیں۔

اس کا معراج نامہ کسی خاص کیفیت کا حامل نہیں۔ وہی روایتی انداز ہے جو بیشتر دکنی شعراء کا ہے۔ تاریخ تصنیف معلوم نہیں۔

مندرجہ بالا تمام شعراء دکنی شاعر ہیں اور ان کے معراج نامہ دکنی[1] اردو میں ہیں۔ ان کا زمانہ گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ اس وجہ سے پیش نہیں کیا گیا کہ ان کا تقابلی جائزہ مقصود نہیں ہے بلکہ لغت میں معراج کے موضوع کی اہمیت بتانا ہے۔

راقم الحروف نے مذکورہ تمام معراج نامہ دیکھے ہیں جو مخطوطات کی شکل میں قومی عجائب خانہ کراچی میں محفوظ ہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ اس لئے پیش نہیں کیا گیا کہ ان کی زبان اور اسلوب زبان کی بتدریج ترقی کا نمونہ ہے۔

۱؎ "دکھنی زبان ہندوستانی کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانان دکن بولتے ہیں اردو کی مانند وہ بھی فارسی نستعلیق میں لکھی جاتی ہے مگر اس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں ہے اس میں بعض خصوصیتیں ہیں۔ جب مسلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اس وقت اس میں بہت سے ایسے محاورات داخل ہو گئے جو اب اردو ادب سے متروک ہو گئے ہیں جب اس نئی زبان کا میل اطراف و جوانب کی زبانوں میں مرہٹی، تامل اور تلنگی سے ہوا تو اس کے محاورے اور ساخت میں کسی قدر فرق آ گیا۔" تاریخ ادب اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری، لاہور ص۵

ان کی افادیت بس اس حد تک ہے کہ شاعری کے ارتقائی ادوار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہاں ان میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے وہ یہ کہ معراج کی غلط اور صحیح روایات کا تفصیلی بیان کم و بیش سب میں مشترک ہے۔

۱۲ شعرائے دکن کے علاوہ شعرائے متوسطین اور متاخرین کے کلام میں باقاعدہ معراج نامے ملتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) حکیم میر قدرت اللہ خان قاسم (۲) شیخ امام بخش ناسخ
۳۔ میر ضمیر لکھنوی۔ ۴۔ منیر شکوہ آبادی ۵۔ صغیر بلگرامی۔ ۶۔ امیر مینائی۔ ۷۔ محسن کاکوروی

مندرجہ بالا تمام شعراء اردو کے بڑے اساتذۂ فن سمجھے جاتے ہیں ان میں منیر شکوہ آبادی، صغیر بلگرامی، امیر مینائی اور محسن کاکوروی امام احمد رضا بریلوی کے معاصر تھے۔

۱۔ **حکیم قدرت اللہ خان قاسم** دہلی وطن تھا۔ شعرائے اردو کا تذکرہ مجموعہ نغز کے نام سے اس کی مشہور تصنیف ہے اس کا ایک بہت طویل معراج نامہ " زبدۃ المعراج کے نام سے ہے۔ اس کا خطی نسخہ قومی عجائب خانہ میں موجود ہے جو راقم الحروف کی نظروں سے گذرا ہے یہ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

توصیف شب معراج

وصف اوسکا ہائے کس منہ سے ہو | سر تصدق جس کو زلف ماہ رو
نور اس شب کا یہ دیکھو، دیکھ کر | آسمان پر داغ ہے یارو قمر
شمس کو آنکھیں ہے بہیں | تھرتھراتا ہے سدا اے ہمنشیں
بعد خفتن الغرض اوس شب کو وال[۱] | سو رہے بستر پہ شاہ انس و جاں
اس طرح سوتا تھا وہ بیدار دل | دل خدا کی یاد میں تھا مشتغل

[۱]۔ اس شعر میں مصرعوں کی ترتیب میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ایک مصرع میں خفتن اور دوسرے میں " سو رہے" سے شعر کا مفہوم فوت ہو جاتا ہے۔

آنکھ تو سوتی تھی دل بیدار تھا　　کارامت میں وہ دل ہوشیار تھا[۱]

قاسم کا یہ معراج نامہ ۱۲۰۰ھ کی تصنیف ہے نمونۂ کلام سے اسکی فکر کا قارئین کرام کو اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اسکے معراج نامہ میں خیال اور بیان کی کوئی جدت نہیں کلام رسمی ہے۔ معراج کی روایات کا بیان سطحی انداز میں پیش ہوا ہے جس میں کوئی کشش اور جاذبیت نہیں ہے۔

۲۔ **شیخ امام بخش ناسخ**　ناسخ دبستان لکھنؤ کے موجد اور امام ہیں۔ متوفی ۱۸۳۸ء شاعری میں ایک طرز خاص کے مالک ہیں۔ غزل کو نیا خط و خال بخشنے میں ناسخ نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

ان کی ایک مثنوی معراج کے موضوع پر بھی ہے۔ لیکن یہ مثنوی ان کے کسی دیوان میں شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک معلومہ قلمی نسخہ فرنگی محل کے علماء کے کتب خانہ میں موجود ہے جس پر رشید حسن خان نے ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ جو انجمن ترقی اردو، کراچی کے سہ ماہی جریدہ "اردو" کے شمارہ ۳ سنہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے

ناسخ کی اس مثنوی کے بارے میں رشید حسن خان لکھتے ہیں۔

"مثنوی کی زبان اور نظم کا انداز بھی اسی کا مؤید ہے کہ یہ ابتدائے مشق کا کلام ہے"۔[۲]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "معراج نامہ چونکہ ابتدائی مشق کی تصنیف ہے۔ اس لئے اس میں نو مشقی کا کرشمہ بھی شامل ہے۔ اس لئے سستی بندش اور بعض الفاظ کے غیر مناسب صرف کے زیادہ نمونے اس میں ملتے ہیں"[۳]

۱۔ زبدۃ الاخبار، مخطوطہ، قومی عجائب خانہ کراچی ورق ۱۰ب و ۱۱ا
۲، ۳:۔ رسالہ اردو شمارہ ۳ سنہ ۱۹۶۸ء، کراچی، ص ۹۵، کراچی ص ۹۶، سنہ ۱۹۶۸ء

معراج کے بیان میں مقام سدرہ کا بیان ایک بڑا اہم بیان ہے جس میں شعراء اپنی پوری قوت فکر صرف کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ناسخ کی فکر اس منزل تک کس انداز میں پہنچی ہے۔[۱]

تا بہ سدرہ پہنچے پھر خیر الانام | تھا درخت سایہ دار و سبز فام
میوہ تھا مقدار میں مثل جو | مشک و عنبر کی چلی آتی تھی بو
مثل پروانہ ملائک بے شمار | گردِ سدرہ پھرتے ہیں لیل و نہار
کوئی ہرگز ان فرشتوں کا عدد | کر نہیں سکتا بجز ذات احد
چار جوئیں زیر سدرہ تھیں رواں | دو عیاں وہ جوئیں تھیں دو نہاں[۱]

سست بندشیں، الفاظ کا نامناسب صرف۔ انداز بیان کی بے کیفی، پرواز تخیل کی بے دست و پائی، لہجے کا غیر شاعرانہ انداز، واقعات کی غیر موثرانہ تفصیل، خلوصِ جذبات کا فقدان اس مثنوی کے بنیادی عناصر ہیں۔

ناسخ کا مزاج شاعری نعت کے پاکیزہ موضوع کی ترجمانی کا سزاوار ہی نہ تھا۔ وہ تو اعصابی لذتیت میں گم تھے جہاں شہوانی تلذذ روحانی اہتزاز پر غالب ہوتا ہے۔ نعتیں کہنے کے لئے جس طہارت فکر کی ضرورت ہے وہ ان میں نہ تھی۔

میر ضمیر لکھنوی **متوفی ۱۸۵۵ء** میر ضمیر ایک صاحب طرز مرثیہ نگار شاعر تھے اس صنف میں ان کا ایک خاص مقام ہے مرثیہ کے مضامین میں تنوع، جدید تشبیہات اور استعارات کا اضافہ معرکہ کارزار کا مفصل بیان، شاعرانہ استدلال ہی وہ اولیت ہے جس کی بنیادوں پر چل کر میر انیس اور میرزا دبیر نے مرثیہ نگاری کے فن کو معراج کمال پر پہنچایا۔

۱۔ بحوالہ مضمون رشید خان۔ رسالہ اردو، شمارہ ۳، کراچی، ص ۱۰۰ ۱۹۶۸ء

ضمیر نے ایک طویل معراج نامہ" ریحان معراج" کے نام سے کہا ہے
جو مثنوی کی صنف میں ہے۔

ضمیر کا معراج نامہ معراج کی روایات کا ایک طویل منظوم بیان ہے
جس میں روایات کا کوئی پہلو ان کی نظر کی زو سے نہیں بچا ہے۔ معراج کی
تمام روایات اپنے ماخذ کے ساتھ نظم کر دی گئی ہیں۔
ان کی داستان سرائی میں نہ خیال آرائی ہے نہ بیانیہ انداز میں کوئی
شاعرانہ کیف، معراج کے واقعات کی روایات اور ضمیر کی منظوم داستان میں
اگر کچھ فرق ہے تو وزن کا فرق ہے۔ ان کے بیان کی غیر ضروری طوالت
نے تاثیر کلام ضائع کر دی ہے۔ پورا معراج نامہ جذبہ کی شدت سے عاری ہے
معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم ترین مقام کی ترجمانی میں بھی ان کا خامۂ
روایات رقم کوئی گل نہ کھلا سکا۔ ملاحظہ ہو۔

دنیٰ سے بڑھے جب تدلّیٰ ہوا[1] مقام آگیا قاب قوسین کا[2]

یہی نہیں کہ ان کا معراج نامہ تاثیر سے معرا ہے بلکہ اکثر ان کے
بیانیہ انداز میں حفظ مراتب کا دامن بھی چھوٹ جاتا ہے۔ ایک مقام
پر ارشاد ہوتا ہے۔

نبی نے لیا دست جبرئیل تھام وہاں سے بڑھایا تھا کل ایک گام
لگے رو کے کہنے ٹھہر جائیے مجھے میری منزل پہ پہنچائیے[3]

منیر شکوہ آبادی ناسخ کے شاگرد تھے۔ اپنے عہد کے بڑے شاعر
متوفی ۱۸۷۹ء مانے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں رام بابو سکسینہ

ع۱۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ (سورہ النجم آیت ۸)

ع۲ میر ضمیر، مولفہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری۔ سری نگر ۱۹۷۲ء ص ۱۹۹

ع۳ ۱۔ ایضاً۔ ص ۱۸۷

اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں "۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخیل ہے۔ قطعات بہت سادہ اور سلیس ہیں۔ غزلوں میں نیا لکھنو کا رنگ ہے مختصر یہ کہ منیر کا مرتبہ اس زمانہ کے شعراء میں بہت بلند ہے"۔ [1]

ان کی ایک طویل مثنوی معراج المضامین ہے۔ اس میں آئمہ معصومین کی کرامات کا بیان بھی ہے اور معراج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات بھی ہیں۔

منیر کا یہ معراج نامہ اپنے شعری محاسن کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ اس میں جذبے اور فن کا بہت اچھا امتزاج ہے۔ ان کے معراج نامہ میں ان کے پیش رد میر ضمیر کی طرح نہ تو محض روایات کا غیر شاعرانہ بیان ہے اور نہ انکے استاد ناسخ کی طرح فنی ناہمواریاں، ان کا معراج نامہ زبان کی سلاست اور روانی کا اچھا نمونہ ہے۔ تشبیہات سادہ اور پر کشش۔ انداز بیان متغزلانہ اور شگفتہ ہے۔ جذبات میں خلوص اور شعریت ہے جس نے مجموعی طور پر ان کے بیان میں تاثیر پیدا کردی ہے۔

منیر کے معراج نامہ کا اصل وصف منظر نگاری ہے۔ معراج کے مختلف منازل کی منظر کشی پر کشش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ معراج کے مختلف مقامات کی عکاسی میں شاعرانہ لطافت بڑی حد تک برقرار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ منیر کی پرواز تخیل بلند ہے اور نکھری ہوئی ہے۔ شب معراج کا ذکر ملاحظہ ہو۔

کہاں ہے ساقی گردوں تعلی	کہاں ہے بادۂ جوز تجلی
پلادے ایک پیمانہ سر بزم	کہ سیر عالم بالا کا ہے عزم
ادھر آ اے مغنی نوا ساز	کہ آئے کان میں زہرا کی آواز

[1] اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری لاہور

رسول پاک ہیں مشتاق شب گیر — شب معراج کی جاگی ہے تقدیر
شبِ مشکینہ خال و عنبریں مو — شبِ کعبہ لباس و خالِ ہندو
بنفشہ زارِ خلدِ کامرانی — کنیز اس رات کی شامِ جوانی
وہ شب جس کا غلام ابرِ بہاری — وہ شب غیرت دہِ مشک تتاری
وہ شب تنویر کعبہ ظلمت دہر — وہ شب ظلِ ہمائے آسماں سیر
وہ شب مفتاح قفلِ راز دانی — وہ شب شقِ نقیضِ لن ترانی
عروجِ طالعِ مسعود کی رات — کلام عابد و معبود کی رات
اسی شب کو رسولِ عرش مسند — عنایاتِ الٰہی سے مؤید
سریرِ خواب پر پرتو فگن تھے — گل قالینِ خیابانِ چمن تھے
عیاں تھے خواب کے آنکھوں میں آثار — دل بیدار مثلِ بخت بیدار
کہ ناگہ پیکِ فرخ فال آیا — فلک سے مژدہ اقبال لایا[1]

لیکن با ایں ہمہ فنی محاسن طوالت کلام نے نفسِ مضموں کو بوجھل کر دیا ہے۔ جو بات اجمال میں جامعیت کے ساتھ کہی جا سکتی تھی۔ منیر نے بلا ضرورت طول دیکر اسے گراں بار کر دیا۔

۵۔ صغیر بلگرامی متوفی ۱۸۹۴ء — صغیر مرزا غالب کے تلامذہ میں تھے اور خود بھی استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کا ایک بہت طویل معراج نامہ بھی ہے جو مسدس کی شکل میں ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

از عرش تا بہ فرش ہے اک نور جلوہ گر — دل کی طرح سے وا ہوئے ہفت آسماں کے در
آٹھوں بہشت ہو گئے آراستہ ادھر — غل ہو گیا کہ آتے ہیں سلطان بحر و بر
لاکھوں فرشتے جمع ہیں اک اک مکاں پر — میلہ لگا ہوا ہے ہر اک آسمان پر
افلاک پر سواری خیر الوریٰ چلی — یا اہلِ شوق کی نظرِ باصفا چلی

[1] ریحانۂ منیر شکوہ آبادی۔ مصنف ڈاکٹر زہرہ بیگم یامین، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء ص ۲۵ اور ۲۶

گلزار دین پاک خدا کی ہوا چلی　　گھوڑا چلا کہ خیر امم کی دعا چلی
ہر مرتبہ براق کو قدر رفیع تھی　　قدرت کے ہاتھ کی وہی نبض سریع تھی[۱]

کلام استادانہ ہے لیکن آورد سے پُر ہے۔ طول کلام کی وجہ سے فضا بہت بوجھل ہو گئی ہے۔ ساڑھے تین سو سے زائد بند ہیں یہی وجہ ہے کہ خیال کا تواتر بھی بعض جگہ نظر آتا ہے۔ لہجے میں مرثیہ نگاری کا انداز ہے۔ موضوع میں غیر متعلق موضوعات کی پیوندکاری کثرت سے ہے جس نے تسلسل مضمون میں رخنہ اندازی کی ہے یعنی معراج نبوی کے ساتھ جگہ جگہ اہل بیت کا بیان بھی ہے جو موضوع سے مناسبت نہیں رکھتا بلکہ ایک علیحدہ موضوع کا متقاضی ہے۔ خود معراج کے موضوع میں صغیر نے خلط مبحث کر دیا ہے۔ معراج بالذات ایک موضوع ہے اس کے کچھ متعین حدود اور قیود ہیں لیکن صغیر نے اس کا لحاظ نہیں رکھا اور اس میں دوسرے موضوع کو مدغم کر دیا۔ فلک اول کے بیان میں شمائل نبی کا بھی طویل بیان ہے جس کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ صغیر کی شاعرانہ فکر موضوعات کی درجہ بندی سے عاری تھی مختصر یہ کہ صغیر بلگرامی کا معراج نامہ معنوی لحاظ سے بھی اختلال پذیر ہے اور صوری اعتبار سے بھی کسی خاص کیفیت کا مظہر نہیں۔

۶۔ **امیر مینائی** متوفی ۱۹۰۰ء　امیر مینائی کا شمار اردو کے بڑے نعت گو شعراء میں ہوتا ہے انھوں نے نعتوں کو فنی زینت بھی بخشی اور اس کی مقدار میں بھی اضافہ کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں: "انیسویں صدی کے وسط سے لیکر آج تک اردو شعراء نے نعت کے موضوع سے جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور جس شغف کے ساتھ اپنے کلام میں حب رسول کو جگہ دی

۱۔ شبستان معراج خطی نسخہ مملوکہ ولی احمد بلگرامی، کراچی، ورق ۱۹۱

ہے اسے اوّل اوّل شاعری کی بلند سطح تک پہنچانے میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی ہی کا ہاتھ رہا ہے[۱]

ان کا ایک معراج نامہ "لیلۃ القدر" کے نام سے ہے۔ باوجود سعی بسیار یہ معراج نامہ میری دست رس میں نہ آسکا لہٰذا اس کا جائزہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ اگرچہ اسے حاصل کرنے میں پیش نظر مضمون کی تکمیل میں خاصی تاخیر سے کام لیتا پڑا لیکن کامیابی نہ ہوسکی جس کا بہت قلق ہے اور اپنی تحقیقی کوتاہی کا شدید احساس

محسن کاکوروی متوفی ۱۹۰۵ء

محسن کا شمار اردو ادب کے سب سے بڑے نعت گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا سرمایہ ہی نعتیں ہیں انکی کلیات میں سوائے ایک[۲] مدحیہ قصیدے کے نعتوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں۔

"محسن کاکوروی متوفی ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۲ھ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نعت گوئی کو سنجیدگی سے ایک مستقل فن کی حیثیت سے اپنایا اور اس بلند سطح تک لے گئے جس سے آگے بڑھنا دوسروں کے لئے آسان نہ رہا۔"[۳]

ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق رقمطراز ہیں "محسن نے زبان کے اعجاز کو ایک ایسے موضوع کے لئے وقف کردیا جو سراپا اعجاز ہے۔ ان کے یہاں زبان کی سلاست روانی، سادگی اور صوفیت ایک موسیقی کا سماں باندھ دیتی ہے۔"[۴]

ایک دوسرے مقام پر یوں اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں "کم سے کم الفاظ

۱:۔ اردو کی نعتیہ شاعری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۵۵

۲:۔ نواب واجد علی شاہ کے لئے کہا گیا ہے۔

۳:۔ اردو کی نعتیہ شاعری۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۵۶

۴:۔ اردو میں نعتیہ شاعری، ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق، کراچی ۱۹۷۶ء ص ۳۲۱

میں زیادہ سے زیادہ مطلب بیان کرنے میں محسن کو خاص مہارت حاصل ہے۔
ان کی ایک مثنوی "چراغِ کعبہ" کے عنوان سے معراج کے موضوع پر ہے
اس مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں "محسن نے نعت کے موضوع پر مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ ان مثنویوں میں "صبحِ تجلی" اور "چراغِ کعبہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی ۱۲۸۹ھ میں اور دوسری ۱۳۰۱ھ میں لکھی گئی ہے۔ دونوں "گلزارِ نسیم"[۲] کی زبان میں لکھی گئی ہیں اور اسی رنگ میں ہیں یعنی تلمیحات، استعارات تشبیہات اور رعایتِ لفظی کی وہ طلسمی فضا جو "گلزارِ نسیم" میں نظر آتی ہے محسن کی مثنویوں پر بھی چھائی ہوئی ہے۔[۳]

محسن کی مثنوی "چراغِ کعبہ" تخیلاتی بیانیہ انداز میں ہے۔ معراج کی روایاتی تفصیل ان کے یہاں بھی ہے لیکن محسن نے اسے اپنے مخصوص اندازِ بیان سے سجی ہوئی تصوراتی وادیوں میں ڈھال دیا ہے۔ وہ اپنی فکر کا پورا زور الفاظ کی تراش خراش، تشبیہات اور استعارات کی زیبائش اور آرائش پر صرف کرتے ہیں جسکی وجہ سے بیان کا آرائشی حسن تو دوبالا ہو جاتا ہے لیکن نفسِ مضمون کی روح اس کے دبیز پردوں میں روپوش ہو جاتی ہے۔

"گریز" کے عنوان سے شبِ معراج کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

تھا دیکھ کے اس ادا کو مفتوں — دشتِ عرفات شکلِ مجنوں
چشم در کعبۂ معلّیٰ — آئینۂ حیرت تماشا
سکتے میں کہ کیا یہ گل کھلا ہے — اس رات کا رنگ روپ کیا ہے
آنکھوں میں ہوا سمٹ کے یکجا — بیدار دلوں کا کیا سویدا
میدانِ نظر میں خلوت آرا — کس چشمِ سیاہ کا ہے پردا

۲۔ دیا شنکر نسیم (وفات ۱۸۴۳ء) کی مثنوی جو زبان اور بیان کے لحاظ سے منفرد مقام رکھتی ہے۔
۳۔ اردو کی نعتیہ شاعری (ڈاکٹر فرمان فتحپوری)، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۶۶۔

دامانِ نگاہ بن کے پھیلی
کس دیدہ منتظر کی پتلی

گلدار ہوئے ہیں سبز فانوس
پنجرے میں ہیں طوطیوں کے طاؤس

واللیل کی زینت حواشی
تفسیر کبیر کہکشاں کی

انجم کا یہ آسماں میں نقشہ
سوسن کی زمین میں بنفشہ

جگنو کا ہوا میں یہ اشارہ
ظلمت کا چمک رہا ہے تارہ

تاریکی میں نور یا الٰہی
آنکھوں میں سماگئی سیاہی

ہر قطرہ وضو کی فکر میں گم
ہر ذرہ کئے ہوئے تیمم

کہتا ہے جھکا ہوا اندھیرا
ہو جائے قبول سجدہ میرا[1]

انداز بیان کی یہ تزئین یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس رات کے تمہیدی اشعار میں کچھ اور نکھری ہوئی۔ ملاحظہ ہو:

بھیگی ہوئی رات آبرو سے
داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے

اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام
شبنم کی ردا بقصدِ احرام

گویا کہ نہا کے آئی فی الحال
جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

کیا سعیِ صفا سے رنگ فق ہے
سر سے پا تک عرق عرق ہے

نامحرموں سے چھپائے چہرا
پروین کو بنائے منہ کا سہرا

آنا کھلتا ہوا نہ جانا
انداز خرام صوفیانہ

سناٹے کا دم انیس و ہمدم
انفاس ہوا رفیق و محرم

خوشبو وہ کہ ہار یاسمن کے
لپٹے ہوئے بالوں میں دلہن کے[2]

ان اشعار سے محسن کی فنی مہارت کا سکہ ضرور دلوں پر بیٹھ جاتا

---

[1]۔ کلیاتِ محسن، مرتبہ مولوی محمد نورالحسن، لکھنؤ، ۱۳۳۲ھ ص ۱۲۷-۱۲۸-
[2]۔ " " ص ۱۲۵

ہے لیکن انداز بیان کی یہ بے پناہ زینت آرائی معراج کی اس رات کو جس کی منظر کشی محسن کر رہے ہیں پر اسرار اور طلسمی رات میں ڈھال دیتی ہے جو فضا نظروں کے سامنے پھیلی ہے وہ حسین ضرور ہے لیکن خواب گوں ہے جو لوریاں دیکر سلا تو سکتی ہے لیکن لمحۂ فکریہ عطا کر کے ذہنوں کو بیدار نہیں کر سکتی۔ ان کی خیال آرائیاں کچھ اتنی گہری ہو جاتی ہیں کہ حقیقی رو قائم نہیں رہتی اور پورا منظر محسن کے خیال کی شعبدہ بازی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالسلام ندوی کو ان کے بارے میں یہ کہنا پڑا " اور ان تمام خصوصیات کے اجتماع نے ان کے کلام کو اس قدر بے اثر کر دیا کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں کسی مذہبی جذبے سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ غرض انہوں نے جو نعتیہ قصائد اور نعتیہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ ایک معمّا اور چیستان ہے نعت نہیں ہے "۔ [۱]

تشبیہات اور استعارات کی حیثیت ایک نازک آبگینے کی ہوتی ہے۔ ذرا ٹھیس لگی اور پاش پاش ہوا۔ محسن باوجود ایک ماہر شیشہ گر ہونے کے ایک مقام پر اپنی وارفتہ مزاجی کے ہاتھوں طفل ناداں بن گئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے یہ آبگینہ چھوٹ کر زمین پر گر پڑا ہے۔ معراج کی رات کی منظر کشی میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

انجم کا یہ آسماں میں نقشہ

سوسن کی زمیں میں بنفشہ

سوسن کی زمین تو ضرور سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن انجم کا بنفشہ سے تعلق عقل میں نہیں آتا جو محسن کا مدعا ہے۔

محسن کا معراج نامہ خوبصورت الفاظ اور نادر تشبیہات کی صناعی

---

[۱]۔ شعر الہند حصہ دوم۔ مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ ۲۰۰

کالپہلو ناگزار ہے۔ جسے انکے دست فکر نے بڑی کاوش سے سجایا ہے اور ان کے تخیل کی رنگینیوں نے اس میں آب رنگ بکھیر دیا ہے۔ لیکن ان کی فکر کی ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے ان کے معراج نامہ میں ایک ایسا معنوی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے ان کو ایک نعت گو کے بلند منصب سے گرا دیا ہے۔

انکی فکر مختلف سیرِ آسمانی سے کامیابی سے گذر کر جب مقامِ اعلیٰ پر پہنچی تو بے اختیاری میں فکر کے ہاتھوں سے احتیاط کا دامن چھوٹ گیا۔ ملاحظہ ہو۔

وحدت کی ہوئی دوئی میں آمد — مانندِ احد میان احمد
دامن میں چھپائے غیر کو عین — واحد تھا نقاب روئے اثنین
عینیتِ غیر رب کو رب سے — غیریت عین کو عرب سے
ذاتِ احمد تھی یا خدا تھا — سایہ کیا میم تک جدا تھا[۱]

یہی نہیں بلکہ وحدت الوجود کا نزاعی مسئلہ بھی چھیڑ دیتے ہیں جس پر شریعت قدغن لگاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

عرفاں کے مقام کی کریں سیر — دیکھیں کہ صفت ہے عین یا غیر[۲]

اور تو اور وارفتگیِ شوق میں اتنے بے قابو ہو گئے کہ سجدے میں درود کی تلقین کرنے لگے۔

کیا ہو گئے حد سے بڑھنے والے
سجدے میں درود پڑھنے والے[۳]

ع۱۔ کلیاتِ محسن، مرتبہ:۔ مولوی محمد نور الحسن لکھنؤ، ۱۳۲۴ھ، ص ۱۵۳

ع۲۔ ایضاً۔ ص ۱۵۳

ع۳۔ ایضاً۔ ص ۱۵۲

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق نے اس نازک نکتے کی وضاحت بہت اچھی طرح کی ہے لکھتے ہیں" کلام مجید میں جو وصف بنی میں مضامین درج ہیں ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت پہلے تو "عبد کی بتائی گئی ہے اور پھر رسالت کے عہدہ جلیلہ پر فائز دکھایا گیا ہے اور بار بار اسکا اعادہ کیا گیا ہے کہ مخلوق کا انتہائی کمال حقیقت میں اسکی عبدیت کا کمال ہے اور اسکے اطراف سارے کمالات گھومتے ہیں جہاں اللہ کی وحدانیت کو لا الہ الا اللہ کہہ کر اصل ایمان قرار دیا گیا ہے وہاں محمد رسول اللہ سے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ محمد کا مقام سفارت سے زیادہ نہیں ہے۔ عطائے الٰہی کی جتنی صورتیں مخلوق کے لئے ہو سکتی تھیں حضور کے شامل حال ضرور ھیں ساتھ ہی بندے کے انتہائی عروج کا مقام بھی یہی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مرتبہ کی اس بلندی کا احاطہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن یہ امر بالکل واضح کر دیا گیا ہے کہ اس کمال کی انتہائی بلندی بھی اُسی مقام کا پتہ دیتی ہے جو عبدیت کی آخری منزل ہے۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفعتِ مقام کو بالکل واضح فرما دیا۔[1]

مولانا احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ

کا

معراج نامہ

پیشِ نظر معراج نامہ قصیدے کے انداز میں ہے جس میں ۶۷ اشعار ہیں۔[2] اسکی تکنیک ما قبل کے سارے معراج ناموں سے بالکل مختلف ہے جن کا جائزہ لیا گیا ہے اس میں معراج کی روایات کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ شبِ معراج کا تہنیت نامہ ہے جس میں بہجت آگیں افکار کی نغمگی کا بہاؤ پورے قصیدے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔

ح ۱ ۔ اردو میں نعتیہ شاعری، ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق، کراچی ۱۹۷۶ء ص ۱۰۲ ـ ۱۰۳

ح ۲ ۔ حدائق بخشش حصہ اول، ناشر کامیاب دار التبلیغ لاہور۔

اتار کر ان کے رخ کا صدقہ یہ نور کا بٹ رہا تھا باڑا
کہ چاند سورج مچل مچل کر جبیں کی خیرات مانگتے تھے

وہی تو اب تک چھلک رہا ہے وہی تو جوبن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لئے تھے

یہ ان کی آمد کا دبدبہ تھا نکھار ہر شئے کا ہو رہا تھا
نجوم و افلاک جام و مینا اجالتے تھے کھنگالتے تھے

وہ باغ کچھ ایسا رنگ لایا کہ غنچہ و گل کا فرق اٹھایا
گرہ میں کلیوں کے باغ پھولے گلوں کے تکمے لگے ہوئے تھے

بچا جو تلون کا ان کے دھون بنا وہ جنت کا رنگ و روغن
جنہوں نے دولہا کی پائی اترن وہ پھول گلزار نور کے تھے

منظر نگاری

اس تہنیت نامہ میں سرور و نشاط کی کیفیت نے ایک متحرک بہاریہ فضا پیدا کردی ہے جسکی عکاسی امام رضا نے نہایت وارفتہ اور پر کیف انداز میں کی ہے ان کے لہجے کی گھلاوٹ کیف و مستی کے تصوراتی منظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم کردیتی ہے اور ہم اس کی سرمستیوں کے بہاؤ میں بہنے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
ادھر سے انوار ہنستے آتے ادھر سے نفحات اٹھ رہے تھے

یہ جوت پڑتی تھی ان کے رخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے

نئی دلہن کی پھبن میں کعبہ نکھر کے سنورا سنور کے نکھرا
حجر کے صدقے کمر کے اک تل میں رنگ لاکھوں بناؤ کے تھے

خوشی کے بادل امنڈ کے آئے دلوں کے طاؤس رنگ لائے
وہ نغمۂ نعت کا سماں تھا حرم کو خود وجد آرہے تھے

یہ جھوما میزابِ زر کا جھومر کہ آرہا کان پر ڈھلک کر
پھوہار برسی تو موتی جھڑ کر حطیم کی گود میں بھرے تھے

دلہن کی خوشبو سے مست کپڑے نسیم گستاخ آنچلوں سے
غلافِ مشکیں جو اڑ رہا تھا غزال نافے بسا رہے تھے

پہاڑیوں کا وہ حسن تزئین وہ اونچی چوٹی وہ ناز و تمکین
صبا سے سبزے میں لہریں آئیں دوپٹے دھانی چنے ہوئے تھے

نہا کے نہروں نے وہ چمکتا لباس آبِ رواں کا پہنا
کہ موجیں چھڑیاں تھیں دھار لچکا حبابِ تاباں کے تھل ٹکے تھے

پرانا پر داغ ملگجا تھا اٹھا دیا فرش چاندنی کا
ہجوم تارِ نگہ سے کوسوں قدم قدم فرش بادے تھے

خدا ہی دے صبر جان پر غم دکھاؤں کیونکر تجھے وہ عالم
جب ان کو جھرمٹ میں لے کے قدسی جناں کا دولہا بنا رہے تھے

ملاحظہ کیجیے منظر کشی کتنی فطری ہے۔ وارفتگی بیان میں رنگ بیان کہیں شوخ نہیں ہونے پاتا۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک لطیف نشاطیہ رو ہے جو پورے منظر پر چھائی ہوئی ہے۔ پرواز تخیل کا سنبھلا ہوا اور متوازن انداز ہے۔ جو بیل بوٹے سجائے گئے ہیں ان میں مقامی بو باس ہے یعنی امام رضا کی IMAGERY میں ملکی رنگ پوری طرح غالب ہے جو اردو شاعری کا اپنا مزاج ہے۔

(۱: خانہ کعبہ کی مغربی بیرونی دیوار ر مقام معراج کے سلسلے میں دو روایتوں میں ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ کعبہ سے متصل شمال کھلی جگہ پر مصروف خواب تھے کہ معراج حاصل ہوئی اس شعر میں اسی روایت کا پرتو ہے)

موسیقی

شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شعر میں موسیقی کا دار و مدار بحر کے انتخاب پر منحصر ہے۔ امام رضا کے مزاج کی نغمگی ملاحظہ کیجیے اپنے تہنیت نامہ کے لئے جس بحر کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بالذات مترنم بحر ہے۔ اس تہنیت نامہ میں کوئی شعر ایسا نہیں جس میں موسیقی کا زیر و بم موجود نہ ہو۔ اس کے سانچے میں جو ہلکے پھلکے خالص اردو الفاظ جڑے گئے ہیں ایک سیال نغمے میں ڈھل گئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حجاب اٹھنے میں لاکھوں پردے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے بچھڑے گلے ملے تھے

براق کے نقش سم کے صدقے وہ گل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن لہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے

زبانیں سوکھی دکھا کے موجیں تڑپ رہی تھیں کہ پانی پائیں
بھنور کو یہ ضعف تشنگی تھا کہ حلقے آنکھوں میں پڑ گئے تھے

شاعرانہ نکتہ سنجی

ان کے معراج نامہ میں شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے ایسے فنکارانہ نمونے نظر آتے ہیں کہ ذوق جمال جھوم اٹھتا ہے ان کو کسی خیال کی توجیہ شاعرانہ پیش کرنے کا بڑا پاکیزہ سلیقہ آتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے

ستم کیا کیسی مت کٹی تھی قمر وہ خاک ان کے رہ گزر کی
اٹھا نہ لایا کہ ملتے ملتے یہ داغ دیکھنا سب مٹے تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال و جلال کی کیفیت کا پرتو اور اسکے اثرات ملاحظہ ہوں

نقاب الٹے وہ مہر انور جلالِ رخسار گرمیوں پر
فلک کو ہیبت سے تپ چڑھی تھی تپکتے انجم کے آبلے تھے

اب ذرا اسی خیال کا عروج بھی دیکھیے:۔

وہ ظلِ رحمت وہ رخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
سنہری زربفت اودی اطلس یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے

یہ طلاقت کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ

واقعاتِ معراج میں مقام سدرۃ المنتہیٰ ایک نازک مقام ہے شعرا نے طرح طرح سے اس کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن امام رضا کا فکری پیمانہ اس مقام کی ترجمانی میں سب سے الگ چھلکتا نظر آتا ہے ملاحظہ ہو:۔

چلا وہ سروِ چماں خراماں نہ رک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکتی رہی وہ کب کے سب این و آں سے گذر چکے تھے

جھلک سی اک قدسیوں پہ آئی ہوا بھی دامن کی پھر نہ پائی
سواری دولہا کی دور پہنچی برات میں ہوش ہی اڑے تھے

تھکے تھے روح الامین کے بازو چھٹا وہ دامن کہاں وہ پہلو
رکاب چھوٹی امید ٹوٹی نگاہ حسرت کے ولولے تھے

روش کی گرمی کو جس نے سوچا دماغ سے اک بھبوکا پھوٹا
خرد کے جنگل میں پھول چمکا دہر دہر پیڑ جل رہے تھے

جلو میں جو مرغ عقل اڑے تھے عجب برے حالوں گرتے پڑتے
وہ سدرہ ہی پہ رہے تھے تھک کر چڑھا تھا دم تیور آگئے تھے

قوی تھے مرغانِ وہم کے پر اڑے تو اڑنے کو اور دم بھر
اٹھائی سینے کی ایسی ٹھوکر کہ خون اندیشہ تھوکتے تھے

مقام اعلیٰ کی ترجمانی میں ان کی فکر کی چابک دستی کا کمال یہ ہے کہ وارفتگی اور سرشاری میں بھی کوئی فرق نہیں آیا اور احتیاط کا دامن بھی فکر کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہیں پایا پوری کیفیت کے ساتھ اس نازک مقام سے گذر گئے۔ انداز بیان کا شاعرانہ حسن اور لہجے کی شگفتگی

باز از جہت ہمہ شکستی — وز زحمتِ فوق و تحت رستی [۱]

مقام قاب قوسین کی ترجمانی ملاحظہ ہو:۔

قاب قوسین او وراں اثنا — از دنیٰ شد بقاب او ادنا [۲]

ان ہی مقامات کو امیر خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

گریبان جہت را پارہ کردہ — جہاں بے جہت نظارہ کردہ [۳]

جلوہ کرد از درائی کونینش — سر بدرگاہِ قاب قوسینش [۴]

اب اسی خیال کو امام احمد رضا کے یہاں بھی دیکھئے کتنی تمکنت اور کیسے وقار کے ساتھ بیان ہوا ہے:۔

خرد سے کہدو کہ سر جھکا لے گماں سے گزرے گزرنے والے — پڑے ہیں یاں خود جہت کو لالے کسے بتائے کدھر گئے تھے

پران کا بڑھنا تو نام کو تھا حقیقۃً فعل تھا ادھر کا — تنزلوں میں ترقی افزا دنیٰ تدلیٰ کے سلسلے تھے

وحدت کلی میں گم ہونے کی کیفیت جس شاعرانہ لطافت سے امام رضا نے پیش کی ہے نظامی جیسا وردی کش بادہ عرفاں اور لیلی سخن کا ادا شناس بھی نہ پیش کر سکا۔ ہاں امیر خسرو نے لامکانی کی کیفیت اچھے انداز میں پیش کی ہے لیکن امام رضا کی فکر نے جو نادر پیرایہ اختیار کیا ہے اس کی ہمہ گیری ان دونوں اساتذہ سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کے دوسرے شعر میں مسئلہ وحدت الوجود جس بلاغت سے پیش ہوا ہے وہ امام رضا ہی کی فکر رسا کے بس کی بات تھی۔ "تنزلات" وحدت الوجود کی اصطلاح ہے۔ جب ذاتِ احدیت عالم کثرت میں نزول کرتی ہے اس عالم کو تنزلات کہتے ہیں۔ نقطۂ وحدت بواسطہ تجلیات دائرہ موجودات ممکنہ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ محمود شبستری[۵] نے اپنی مثنوی "گلشن راز" میں اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

۱؎ مثنوی لیلیٰ و مجنوں از خمسہ نظامی — ۲؎ مثنوی ہفت پیکر از خمسہ نظامی

۳؎ مثنوی خسرو و شیریں از خمسہ امیر خسرو — ۴؎ مثنوی ہشت بہشت از خمسہ امیر خسرو

۵؎ مولانا سعد الدین محمود شبستر کے رہنے والے تھے جو تبریز کے قریب ہے ۷۱۷ھ میں انہوں نے اپنی مثنوی گلشن راز کہی، یہ ان کی مثنوی مسئلہ وحدت الوجود کی معرکۃ الآرا منظوم تشریح ہے اور فارسی کے صوفیانہ ادب میں بلند درجہ رکھتی ہے۔

برو خلق جہاں گشتہ مسافر [۱] — یکی خط است ز اول تا بہ آخر

اب ذرا یہ شعر دیکھیئے :-

تنزلوں میں ترقی افزا دنی تدلیٰ کے سلسلے تھے [۲] — پر ان کا بڑھنا تو نام کو تھا حقیقۃً فعل تھا ادھر کا

مصرع ثانی میں تصوف کی اصطلاح "تنزلات،، کے ساتھ آیۂ کریمہ کے لفظ "دنیٰ" نے مل کر کتنے بلیغ معنی پیدا کردیئے ہیں ،، تدلیٰ ،، اور فریب / کا ٹکڑا اضافی ہے جو زور کلام کے لئے لایا گیا ہے۔

یہی نہیں بیان کی قدرت دیکھیئے انداز بدل کر اسی خیال کو یوں بھی پیش کرتے ہیں

محیط کی چال سے تو پوچھو کدھر سے آئے کدھر گئے تھے — کہاں امکان کے چھوٹے نقطو تم اول آخر کے پھیر میں ہو

اسی کے جلوے اسی سے ملنے اسی سے اس کی طرف گئے تھے — وہی ہے اول وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر

ان نازک مقامات کو اسی کی فکر چھو سکتی ہے جو بحر علم کا شناور بھی ہو وادی عرفان کا سالک بھی اور ساتھ ہی عروس سخن کا ادا شناس بھی۔

بلاشبہ امام احمد رضا قدس سرہُ العزیز کا معراج نامہ اردو کی نعتیہ شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اس معراج نامہ میں مروجہ روش سے ہٹ کر ایک نئے انداز کا گہرا رنگ ہے جس میں معراج کی روایتی تفصیل کے بجائے ایک تاثراتی فضا پورے قصیدے پر پھیلی ہوئی ہے جس میں ساز و آہنگ کا ارتعاش روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے یہ معراج نامہ موضوعاتی ہوتے ہوئے ان کے انداز بیان کی وجہ سے تاثراتی فضا میں ڈھل گیا ہے اور یہی اس کی بنیادی صفت ہے جو اس کو دوسرے معراج ناموں سے ممتاز کرتی ہے۔ خوش ذوقی، فنی مہارت، بالغ نظری، جمالیاتی احساس قادرالکلامی، ندرت فکر و خیال اور جذباتی صداقت یہی وہ عناصر ہیں جن کی ترکیب سے اس کی تشکیل ہوئی ہے اس کا نمایاں پہلو خلوص ہے۔ امام رضا نے اپنے

---

[۱] :۔ مثنوی گلشن راز

[۲] ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوسَین (سورۃ النجم آیت ۹)

خیالات کو ہمارے سامنے عقل و ذہن کی سطح سے اتار کر احساس اور جذبے کی گہرائیوں میں ڈبو کر پیش کیا ہے اسی لئے ان کا خیال ہمارے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ ان کا انداز بیان نہ خطیبانہ ہے نہ صوفیانہ بلکہ خالص شاعرانہ ہے۔ ان کی فکر نے معراج نامہ کی زبان اور بیان کو ایک نیا اور دلکش پیکر دیا ہے وہ تخیل سے واقعات کی تفصیل کا کام نہیں لیتے بلکہ تاثر کے بہاؤ کو جذبے کی صداقت اور خلوص کی گہرائی کے ذریعہ مربوط طور پر پیش کرتے ہیں یہی تاثراتی ارتباطِ خیال اور اسکی خوبصورت پیشکش جوان کے سلیس مترنم Diction کے ذریعہ ابھرتی ہے اس معراج نامہ میں ان کا فنی اسلوب بن گئی ہے۔ اپنے اسی انفرادی انداز کی وجہ سے وہ محسن کاکوروی پر بھی فائق ہیں۔ محسن کے معراج نامہ میں انداز بیان کا نکھار فارسی کی کلاسیکی بندشوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے برعکس معراج نامہ رضا میں ان کے ہلکے پھلکے مترنم خالص اردو الفاظ نے جو سحر آفریں کیفیت پیدا کی ہے اس کی لذت بہت گہری ہے اور یہی ان کے نطق کا اعجاز ہے جو خلوص انفاس کے بغیر ممکن نہیں۔

تعارف

قارئین کرام واضح ہو کہ بزم اہلسنت کراچی ایک دینی تنظیم ہے جس کا نصب العین ہر دلِ مسلم میں عشق و اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ پیدا کرنا۔

بزم کے اغراض و مقاصد

۱۔ مسلک اہلسنت وجماعت کی تحریر و تقریر کے ذریعے خدمت کرنا

۲۔ عوام کی معلومات کیلئے گاہے بگاہے مختلف دینی رسائل شائع کرکے مفت تقسیم کرنا

۳۔ دینی لائبریریوں کا قیام

۴۔ قرآن کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے دینی مدارس کا قیام کرنا۔

۵۔ اسلامی نظام تعلیم کی ترویج کے لئے ہر مفید اقدام کرنا۔

۶۔ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وخلفاء راشدین و دیگر بزرگان دین کی یاد میں جلسے و جلوس کا اہتمام کرنا

۷۔ اپنے علاقے میں فلاحی و رفاہی کام کرنا وغیرہ اس کے مقاصد ہیں۔

نوٹ:۔ یاد رہے کہ فی الحال بزم اہلسنت کراچی کے زیر اہتمام اخوند مسجد میں تین مدرسے قرآن مجید کی تعلیم دینے میں سرگرم عمل ہیں۔ اسی بزم کے تحت حج و زیارت کے مسائل پر ایک ضخیم کتاب انوار البشارۃ چھپ چکی ہے جو حاجی حضرات کو مفت دیجاتی ہے

ہم امید کرتے ہیں کہ ان نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے آپ بزم اہلسنت کے ساتھ بھرپور تعاون فرما کر عند اللہ ماجور ہوں گے۔